سورۃ العصر

کی حکیمانہ انقلابی تفسیر

پیش لفظ

انسانی اجتماع (Society) کو ترقی دینے میں جن بلند فکر اور عالی دماغ لوگوں نے حصہ لیا، ان میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ایک خاص بلند مقام ہے، آپ اب سے کوئی چار ہزار سال پہلے "اُر" (عراق) کے مقام پر پیدا ہوئے۔

آپ سے پہلے جن لوگوں نے انسانی اجتماعات کی رہنمائی کی، ان کا فکر اپنے مخصوص اجتماع کی ترقی کو مرکز بنا کر کام کرتا رہا۔ لیکن آپ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے انسانیت عامہ کو اپنے فکر کا محور بنایا۔ اس حیثیت سے آپ بے شک "امام الناس"[1] (نوع انسانی کے لیڈر) کہلانے کے صحیح معنوں میں مستحق ہیں۔

نیز سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہر معاشرے کا ہادی اپنے معاشرے والوں کو ذات الٰہی کے تصور دلانے کے لئے ارد گرد کے ماحول کو استعمال کرتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا رہا کہ ہادی کے گزر جانے کے بعد لوگ ان مظاہر قدرت الٰہی ہی کو "خدا" مان کر پوجنے لگتے اور شرک میں مبتلا ہو جاتے۔ سیدنا ابراہیمؑ پہلے ہادی ہیں جنہوں نے مظاہر طبعی کی بجائے انسانی روح کو خدا شناسی کا ذریعہ بنایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا شناسی آسان ہو گئی۔ اور نیچر پر قبضہ کر کے اسے انسانی ترقی کے لئے استعمال کرنے کا راستہ صاف ہو گیا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کو حنیفیت کہتے ہیں۔ یہ دعوت کیا تھی؟ اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ آپ انسانیت کو دو لعنتوں سے، جو آپ کے زمانے تک پیدا ہو چکی تھیں، بچانا چاہتے تھے یعنی:

۱۔ شہنشاہیت انسانی (Imperialism)

۲۔ الوہیت انسانی (Brahmanism)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسانی اجتماع میں ایسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں، جو ملکی سیاست پر قبضہ کر کے اپنے خاندان یا اپنی جماعت کے مفادات (Interests) کو ترقی دینے والے قوانین نافذ کرتے ہیں اور اس طاقت کے

---

[1] اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ (سورۃ بقرہ 2:124)

بل بوتے پر اپنی رعایا سے ناجائز فائدے اٹھاتے ہیں اور انہیں ناجائز ٹیکسوں کے بوجھ تلے اتنا دباتے ہیں کہ انہیں ان ٹیکسوں کے ادا کرنے کے لئے محنت و مشقت کرتے رہنے کے سوا کوئی وقت ہی نہیں ملتا، کہ انسانیت کو ترقی دینے کی طرف متوجہ ہوں۔[1] یہ حالت انسانیت کے لئے بہت بڑی لعنت ہے۔ سیدنا ابراہیم اس کے خلاف بہت بلند درجے کے باغی تھے۔[2]

ایسے ہی بعض اوقات علمی طبقہ عوام کو علم عامہ سے محروم کر دیتا ہے۔ اور خود علم کا اجارہ دار بن کر بیٹھ جاتا ہے اور اس علمی اجارہ داری کے طفیل عوام پر "خدائی" کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام ان سرمایہ دارانہ علم کے محتاج بن کر رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح علمی طبقہ عوام کو طرح طرح سے لوٹتا ہے۔ وہ جہالت میں مبتلا ہو کر سعادت اخروی پر غور کرنے کی استعداد بھی کھو بیٹھتے ہیں اور رفتہ رفتہ انسانیت ہی سے محروم ہو جاتے ہیں۔[3] یہ برہمنیت (Brahmanism) بھی انسانیت کے لئے بہت بڑی لعنت ہے اور سیدنا ابراہیمؑ چاہتے تھے کہ انسانیت کو اس "انسانی اُلوہیّت" سے نجات دلائیں۔

سیدنا ابراہیمؑ نے انسانی روح کو خدا شناسی کا ذریعہ بنا کر بتا دیا کہ :

(۱) تمام انسان اپنے اندر خدا شناسی کا جوہر رکھتے ہیں۔ انبیاء اور ان کے شاگرد اسی کی بیداری کی کوشش کرتے رہے۔

(۲) چونکہ سب، انسانیت کے لحاظ سے برابر ہیں، اس لئے کوئی انسان اپنے جیسے دوسرے انسان کا خدا نہیں بن سکتا چہ جائیکہ "شہنشاہ" بن کر بیٹھ جائے اور لوگوں کو غلام بنائے رکھے۔

(۳) خدا شناسی ہر ایک انسان کی انسانیت کا، فطری تقاضا ہے، اس لئے معرفت الٰہی کا علم اسے مفت ملنا چاہئے، جیسے ہوا اور پانی سب انسانوں کے لئے ہیں۔

(۴) اجتماع انسانی میں صرف خدا کا قانون چل سکتا ہے، کسی حاکم کا (خواہ وہ بادشاہ ہو یا شہنشاہ) قانون نہیں چل سکتا۔ انسانیت کا شرف اس میں ہے کہ انسان صرف خدا کے قانون کے آگے جھکے۔ یہ انسانیت کی آزادی کا

---

[1] ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ امام ولی اللہ دہلویؒ طبع مصر جلد اول ص ۱۰۵

[2] قرآن حکیم سیدنا ابراہیمؑ کا قول نقل کرتا ہے کہ انہوں نے اپنے مخالفین سے ایک موقعہ پر فرمایا: اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؗ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ اور ان کے ساتھیوں نے کہا۔ ہم تم سے اور ان سے جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے ہو اپنی بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔ ہم تمہارے پروگرام کے منکر ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان دائمی عداوت اور بیر ظاہر ہو گیا ہے۔ جو اس وقت تک قائم رہے گا جب تک تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔ (ممتحنہ 4)

[3] ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغۃ امام ولی اللہ دہلویؒ طبع مصر (جلد اول ص 106)۔

اعلان تھا۔ یہ وہ توحید ہے جس کے سیدنا ابراہیمؑ داعی تھے اور توحید کا یہی تخیّل ان کی تحریک حنیفیت کا (اور بعد میں اسلام کا جو دعوت حنیفیت ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے) سنگ بنیاد تھا۔

(۵) انسانیت میں تمام انسان برابر کے شریک ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ نعمتوں سے فائدہ حاصل کرنا ہر ایک انسان کا حق ہے۔ کسی انسان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنی چالاکی اور ہوشیاری سے یا اپنے جیسے خود غرض لوگوں کا اجتماع پیدا کرکے ان کی طاقت کے بل بوتے پر خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو اپنے اور اپنے چند ساتھیوں کے لئے مخصوص کرکے کمزور انسانوں کو ان سے محروم کردے۔

غرض اس عظیم فکر کے ذریعے سے سیدنا ابراہیمؑ نے ایک طرف تو انسانی ربوبیت (شہنشاہیّت اور مطلق العنان پادشاہی) کا خاتمہ کردیا اور دوسری طرف خدا شناسی کے علم کو عام کرکے برہمنیت کا خاتمہ کردیا اور تمام انسانوں کو خدا کی بندگی میں لاکر مساوات کی سٹیج پر لاکھڑا کیا، اس طرح انسان اور انسانیت کا پایہ بہت بلند کردیا۔

تحریک حنیفیت کا یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ جو لوگ اس تحریک کو قبول کریں گے، وہ کفر، ظلم، شرک، غلامی اور فکری غلامی کے خلاف ایک طاقت ور پارٹی بن جائیں گے اور معاشرے میں سے ظلم کی تمام شکلیں مٹانے کے ذمہ دار ہوں گے۔ یہ اس عظیم الشان انسانیت گیر تحریک کا انقلابی پہلو ہے، جسے سب سے پہلے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سرکردگی میں کام کرنے والی جماعت مہاجرین وانصار نے عمل میں لاکر دکھایا اور اب یہ اصول ہر ایک قوم اور ہر زمانے کے لئے بنیادی اصول بن گیا کہ جب معاشرے میں ظلم بڑھ جائے تو ایک حنیفی جماعت اسے انقلاب کے ذریعے دور کرے گی۔

تحریک حنیفی ابراہیمی کا یہ وہ اصول ہے جس کی مکمل تشریح اس "سورۃ العصر" میں کی گئی ہے۔

آپ نے اس فکر کی اشاعت کے لئے ایک طرف عرب کی وادی غیر ذی زرع (بے آب وگیاہ) میں "بیت اللہ الحرام" کا مرکز قائم کیا۔ جہاں اپنے بڑے بیٹے سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کو بسایا اور دوسری طرف "کنعان" میں مرکز قائم کیا، جہاں اپنے دوسرے فرزند جلیل سیدنا اسحٰقؑ کو بسایا۔

حکمت الٰہی کے تقاضے کے مطابق پہلے "کنعان" کی سرزمین سے اس فکر کی اشاعت شروع ہوئی۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے اس علم کو بلند کیا جن میں سیدنا یوسف، سیدنا موسیٰ اور سیدنا عیسیٰ علیہم السلام جیسے "الوالعزم" داعی پیدا ہوئے۔ بنی اسرائیل کو تورات جیسا بین الاقوامی قانون عطا ہوا، لیکن بدقسمتی سے وہ قبائلیت سے اوپر نہ اٹھ سکے اور اس انسانیت گیر تحریک کی جتنی اشاعت ہونی چاہئے تھی نہ ہوسکی!

اسرائیلی شاخ سے حنیفی (ابراہیمی) فکر کی جس قدر خدمت ہوسکتی تھی وہ ہوچکی اور ان میں اس فکر کو آگے

بڑھانے کی مزید صلاحیت ظاہر نہ ہوئی تو حکمت الٰہی نے ابراہیمیؑ نسل کی دوسری شاخ بنی اسمٰعیل سے جو عرب میں بین الاقوامی پوزیشن حاصل کر رہے تھے، یہ خدمت لینی چاہی اور ان کی رہنمائی کی خاطر انہی میں سے بہترین انسان کو منتخب کر کے ہدایت کا ذریعہ بنایا۔ اس نبی معظم کا نام محمد (ﷺ) ہے اور اسے اس پروگرام کی تکمیل کے لئے جو انقلابی لائحہ عمل دیا گیا وہ قرآن حکیم ہے۔

قرآن حکیم وہ کتاب عظیم ہے، جس میں انسانی انقلاب کا مکمل پروگرام دیا گیا ہے۔ اس میں انسانیت کے خواص بتائے گئے ہیں اور وہ اقدار معین کی گئی ہیں، جنہیں قائم کرنے ہی سے معاشرہ، انسانی اصولوں پر ترقی کر سکتا ہے۔ چونکہ یہ اصول انسانی فطرت کی ترجمانی کرتے ہیں، اس لئے غیر متبدل ہیں، یعنی جب تک انسان بحیثیت انسان زندہ ہے، قرآنی اصول حیات اس کے معاشرے کی سیاسی، اقتصادی، اخلاقی اور روحانی پہلوؤں کی ترقی و تربیت کا مکمل کورس ثابت ہوتے رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد کسی اور نبی کی ضرورت نہیں رہی اور یہی سبب ہے کہ قرآنی اقدار کو رجعت پسند افراد و اجتماعات کے چنگل سے بچانے کے لئے انقلاب کا نسخہ تجویز کیا گیا۔ یہ وہ نسخہ ہے جسے ہر زمانے میں ہر ایک جماعت، جو ان اقدار کو معاشرے میں قائم کرنا چاہے استعمال میں لاسکتی ہے۔ اب جب کبھی معاشرے میں ارتجاع (Reaction) پیدا ہوگا، انقلابی قوتیں ابھرتی رہیں گی اور ارتجاع کا خاتمہ کرتی رہیں گی۔ اس لئے بھی اب کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں رہی۔

اس انقلابی پروگرام کو چلانے کے لئے محمد رسول اللہ ﷺ نے ایک نہایت مضبوط، جاں نثار جماعت (پارٹی) پیدا کی، جس کی نظر، بین الاقوامی (Internationalist) بلکہ انسانیت گیر تھی۔ اس بین الاقوامی پارٹی یا حزب اللہ کی تنظیم نہایت مستحکم طبعی اصولوں پر کی گئی، جو رہتی دنیا تک انقلاب کی تکمیل میں مدد دیتی رہیگی۔ اس طرح پارٹی بنا کر کام کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس پروگرام کو چلانے والی حکومت پیدا ہوگئی جس نے انسانیت عامہ کی ترقی میں اقتصادی اور روحانی پہلوؤں کو برابر اپنے سامنے رکھا۔

یہ پارٹی کس طرح بنائی گئی؟ اس کے اساسی قواعد قرآن حکیم کی اس مختصر سورۃ العصر میں منضبط کر دیئے گئے ہیں۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ (1944-1872) نے اس سورت کی تفسیر میں یہی اصول واضح کئے ہیں۔ امید ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ انہیں نہایت غور سے مطالعہ کر کے قرآنی انقلاب کی تکنیک کو سمجھنے میں ان سے فائدہ اٹھائے گا۔ واللہ المستعان۔

بشیر احمد بی۔اے

تفسیر سورۃ العصر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالْعَصْرِ ۝١ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝٢ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝٣

(۱۰۳: ۱-۳)

(زمانہ کی قسم ! یقیناً انسان گھاٹے میں ہے، سوائے ان کے جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور اچھے کام کئے اور آپس میں حق کی تلقین کرتے رہے اور صبر واستقامت کی تقلین کرتے رہے۔)

تمہید

مختلف قوموں میں نبیوں کے ذریعے سے جو شریعتیں آئیں، ان میں بعض اصول ایسے ہیں جو سب الہامی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ گویا علوم متعارفہ (Postulates) ہیں۔ ان کے مجموعے کو دین کہتے ہیں۔

مثلاً یہ عقیدہ کہ خدا ایک ہے، موت کے بعد بھی زندگی ہے۔ انسانوں کو ان کے عملوں کی جزا (یا سزا) ملتی ہے، مختلف قسم کی شخصی نیکیاں (اصول ارتفاقات [1]) مثلاً طہارت، نماز، زکوۃ، روزہ، حج، نفلی عبادات وغیرہ اور مختلف معاشرتی اصول و معاشرتی ارتفاقات [2] مثلاً نکاح، اجتماعی عدل قائم کرنے اور ظلم کو مٹانے کی کوشش کرنا، غلط کاروں کو سزا دینا، اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے لڑنا، یہ سب دین کے اصول کہلاتے ہیں۔

ان عقیدوں، شخصی نیکیوں، معاشرتی اور ثقافتی اصولوں نے ہر زمانے میں قوموں کے مزاج اور جغرافیائی اور تاریخی حالات کے مطابق مختلف شکلیں اور صورتیں اختیار کی ہیں۔ ان خاص شکلوں کا مجموعہ جو دین کے اصول ہر زمانے میں اختیار کرتے رہے ہیں، اس زمانے کی شریعت کہلاتا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول، ص 87-86)

---

[1] اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے طریقے
[2] زندگی کی مشکلوں کو آسان کرنے کے طریقے

قرآن حکیم کا اسلوب بیان یہ ہے کہ وہ دین کے بنیادی اصولوں کی تشریح بعض چھوٹی سورتوں میں کر دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ لمبی سورتوں میں، جہاں ان اصولوں کے استعمال کی ضرورت پڑتی ہے، ان پر تفصیلی بحث نہیں کرتا۔ بلکہ صرف اشارہ کر دینا، یا ان کے لئے اصطلاحی الفاظ استعمال کرنا ہی کافی سمجھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لمبی سورتوں میں ان اصولوں کو انہی معنوں میں لیا جائے گا، جو چھوٹی سورتوں میں معیّن کئے جا چکے ہیں۔ مثلاً قرآن حکیم میں بار بار آتا ہے: "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" (جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور اچھے عمل کئے) اس مختصر سے فقرے میں دو اصطلاحیں آئی ہیں۔

"اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" اور "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" ان دونوں اصطلاحوں کی تشریح سورۂ عصر میں کر دی گئی ہے۔ اس لئے قرآن حکیم کے باقی مقامات میں ان اصطلاحوں سے وہی معنی مراد ہوں گے، جو اس سورت میں معیّن کئے گئے ہیں۔

جو لوگ قرآن حکیم کے اس اسلوب بیان اور اس قسم کی اصولی آیتوں کی مراد اچھی طرح سے نہیں سمجھتے، وہ اس کتاب عظیم کا مقصد معین کرنے میں ٹھوکریں کھاتے ہیں اور وہ ہر ایک سورت میں اصولی کلمات کے الگ الگ معنی کرتے ہیں، جو ان کے خیال میں اس جگہ کے لئے موزون ہوتے ہیں۔ یہ انکی بڑی بھول ہے۔

اب ہم اس سورت پر نظر ڈالتے ہیں۔

وَالْعَصْرِ: قسم ہے زمانے کی۔

اس میں واؤ قسمیہ ہے۔

قسم کی حقیقت:

شریعت اسلامیہ کا یہ قطعی حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی قسم کھانا یا حلف اٹھانا جائز نہیں ہے۔

چنانچہ حضرت نبی اکرم ﷺ نے صاف لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے کہ "مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللهِ فَقَدْ اَشْرَكَ (حدیث) (جس نے اللہ کے سوا کسی اور کا حلف اٹھایا اس نے شرک کا ارتکاب کیا) اس حدیث میں شرک سے مراد خواہ اس کا ادنیٰ درجہ ہی لیا جائے، بہر کیف وہ شرک ہی کی مد میں آتا ہے، لیکن تعجّب ہے کہ خود قرآن حکیم میں بہت جگہ غیر اللہ کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔ ان مقامات میں سے ایک یہ مقام 'والعصر' بھی ہے۔

بات یہ ہے کہ جب کسی امر کے متعلق دو فریقوں میں جھگڑا ہو جائے، تو ہر ایک فریق سے دلیل یا شہادت طلب کی جاتی ہے۔ دلیل سے مراد یہ ہے کہ کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں کو اس طرح سے کھول کر بیان کر دینا کہ سننے

والا اسے اچھی طرح سے سمجھ جائے۔ جو شخص اس طرح سمجھنے کا عادی ہو، اسے دلیل ہی دی جانی چاہئے اور اس کے سامنے مفصّل طور پر بیان کرنے میں بخل سے کام نہیں لینا چاہئے۔ شہادۃ بھی دلیل ہی کی ذیل میں آتی ہے۔

لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مخاطب کے سامنے کوئی بات کھول کر بیان کی جائے تو اس کا ذہن الجھاؤ میں پڑ جاتا ہے۔ جب وہی بات مختصر طور پر مثال کے ذریعے سے سمجھا دی جائے تو اسے آسانی سے سمجھ لیتا اور مطمئن ہو جاتا ہے، مثال کے لئے کبھی کلمۂ قسم بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کا طرز بیان اِسی کلمۂ قسم کا ہے وہ کبھی تو دلیل بیان کر دیتا ہے، کبھی مثال سے کام لیتا ہے اور کبھی مثال کے لئے کلمۂ قسم ہی استعمال کر کے ایک حقیقت مخاطب کے ذہن نشین کر دیتا ہے۔

اسلامی قانون یہ ہے کہ جو فریق دلیل نہ لا سکے وہ قسم کھاتا ہے۔ اس موقع پر قسم سے مراد یہ ہوتی ہے کہ قسم کھانے والا اپنے سچے ہونے پر اللہ تعالیٰ کو، جو عالم الغیب ہے، بطور گواہ پیش کرتا ہے، اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اگر میں جھوٹ بولوں گا تو اللہ تعالیٰ مجھے سزا دے گا۔ اس قسم کی شہادت ایک دیندار مسلمان سے یقیناً قبول کر لی جاتی ہے لیکن اسلام اس بات کو ہرگز جائز نہیں رکھتا کہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو حقیقی معنوں میں علم غیب حاصل ہے اور اسے یہ قدرت بھی حاصل ہے کہ وہ جھوٹے کو اس کے جھوٹ کی سزا دے۔ ان معنوں میں بے شک یہ درست ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی قسم کھاتا ہے وہ شرک کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ جس کی میں قسم کھا رہا ہوں، وہ ہر قسم کا ذاتی علم غیب بھی رکھتا ہے اور مجھے سزا بھی دے سکتا ہے۔

قرآن حکیم میں خدا تعالیٰ نے جو قسمیں کھائی ہیں وہ تمثیل کے لئے ہیں اور جن چیزوں کی قسمیں کھائی گئی ہیں وہ بطور گواہ یا مثال پیش کی گئی ہیں۔

چنانچہ اس سورت میں "عصر" (زمانے) کو اسی غرض کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

عصر کے معنی ہیں وقت، جس کے ساتھ "گزرنے کا" تصور بھی ہو، یعنی گزرنے والا زمانہ [1]

زمانے کے گزرنے سے معاشرے میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں یہ ضروری نہیں ہے وہ صالح اور صحیح ہی ہوں۔ بعض غلط کار لوگوں کے اثر سے بڑی تبدیلی (Absolute time) بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ معاشرے کی یہ غلطیاں اور غلط کاریاں ملاء اعلیٰ کی سکرین (Screen) پر غلط رنگ کا اظہار کرتی رہتی ہیں اور ملاء اعلیٰ کے فرشتے اس رنگ

---

[1] جب زمانے کے ساتھ گزرنے کا تصور نہ ہو، اور مطلق زمانہ مراد ہو تو اسے دہر کہتے ہیں۔

کے بدلے جانے کے لئے ذات باری سے دعا کرتے رہتے ہیں۔ جب حکمت الٰہی چاہتی ہے کہ معاشرے میں انقلاب آئے۔۔۔ اور اس "چاہنے" کے خاص قاعدے اور اصول ہیں،۔۔۔ اس وقت معاشرے میں انقلابی قوتیں ابھرنے لگتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی اس شان ربوبیت کے متعلق حجۃالاسلام امام ولی اللہ دہلویؒ رقمطراز ہیں کہ :

(انسان کی تخلیق کے بعد نوع انسان کی تربیت کا دور شروع ہوا)، اس مرتبے میں ربوبیت الٰہی دو شعبوں میں تقسیم ہو گئی۔

(۱) ربوبیت کے وہ احکام، جن پر زمانے کے تغیر و تبدل کا کوئی اثر نہیں پڑتا، مثلاً احوال و افعال و اخلاق جیسے نطق انسانی، اس کی ہنسنے کی عادت، اس کی جرأت اور کیاست اور معاشرہ انسانی کے لئے ضروری ارتفاقات اور بِرّ واِثم کے اصول جو انسانوں کو اسی طرح طبیعی الہام کے ذریعے سے ملتے ہیں، جیسے شہد کی مکھی یا چڑیا کو۔

(۲) ربوبیت کے وہ احکام، جو زمانے کے بدلنے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں، ان تبدیل ہونے والے احکام کی غرض یہ ہوتی ہے کہ انسان صورت نوعیہ انسانیہ کے ساتھ تَشَبُّہ قائم رکھے، جو ان ادوار و اعصار کے ساتھ مقرون ہے اور بِرّ واثم کے اصول کو زمانے کے لئے مناسب صورتوں میں پیش کرے۔

مطلب یہ ہے کہ انسانیت کے دو حصے ہیں۔ ۱۔ بنیادی انسانیت، جس میں کبھی بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ ۲۔ انسانیت کے وہ پہلو جو ہر دور اور زمانہ کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ یہ تبدیلی اگر اچھی ہے تو فَبِھا، ورنہ اسے تبدیل کر کے حقیقی انسانی پہلو کی طرف لانا ہو گا۔ روح عصر (Zeitgeist) یعنی ملاء اعلیٰ کے فیصلے انسانی معاشرے میں ان انسانوں کے ذریعے سے پھیلتے رہتے ہیں، جو حساس ذہنوں کے مالک ہوتے ہیں اور جب معاشرتی تبدیلیوں کے خراب پہلو غالب آجاتے ہیں، تو ایک بڑا انقلاب آکر معاشرے کی حالت تبدیل کر دیتا ہے۔ جو لوگ معاشرے کے اندر غلط تبدیلیوں کا سدباب کرنے کی جدوجہد نہ کریں، وہ بھی نقصان اٹھاتے ہیں اور جو غلط تبدیلیاں کر کے اپنے مفادات کو ترقی دیتے ہیں وہ بھی آخر نقصان اٹھاتے ہیں۔

زمانے میں یہ تبدیلیاں ہمیشہ آتی رہی ہیں اور ہمیشہ آتی رہیں گی۔ ہمارے خیال میں 'عصر' کے اس تصور کا ایک پہلو تاریخ بھی ہے جو گزرے ہوئے زمانے کے واقعات کے مجموعے کا نام ہے گویا اس آیت میں تاریخ ہی کی شہادت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

تاریخ کی شہادت پیش کرنا، اعلیٰ درجے کا علمی استدلال ہے۔ البتہ جو لوگ تاریخ کی اہمیت نہیں سمجھتے، وہ اس استدلال کی اہمیت کو بھی پوری طرح سے سمجھ نہیں سکتے۔ خود قرآن حکیم گزشتہ اقوام کے حالات سے بھرا پڑا ہے اور

وہ بار بار کہتا ہے :

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١١﴾ (٦ : ١١)

(یعنی مختلف ممالک میں چل پھر کر دیکھو! کہ جن لوگوں نے خدا تعالیٰ کی ہدایت سے منہ موڑا، ان کا انجام کیا ہوا؟)۔

وَالْعَصْرِ ﴿١﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ﴿٢﴾

(انسانی تاریخ گواہ ہے کہ انسان یقینا گھاٹے میں ہے)۔

روح عصر (Spirit of the Age) کے، ان اثرات کے ظہور کے وقت انسان کی حکمت عملی کا تقاضا کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ جو لوگ اس وقت حق قائم کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور عملی جدوجہد شروع کردیتے ہیں، ان کے سوا باقی تمام انسان نقصان اٹھاتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو ارتجاع میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ بھی جو ارتجاع میں مبتلا نہ ہوتے ہوئے انقلاب کے لئے نہیں اٹھتے۔

زمان و مکان کی یہ وہ معاشرتی حقیقتیں ہیں جن کی طرف قرآن حکیم نے پہلی مرتبہ انسان کی توجہ دلائی ہے اور انسان کو آمادہ کیا ہے۔ زمانے کی تسخیر کر کے اسے اپنی منزل کی طرف چلنے پر مجبور کر دینا بھی انسانی شرف ہے۔

انقلاب کے عملی اُصُول :

قرآن کہتا ہے کہ جب سے انسانی تاریخ لکھی گئی ہے اس پر نظر ڈالو! تم دیکھو گے کہ وہ اس امر کی ناقابل تردید شہادت بہم پہنچاتی ہے کہ جب تک کسی انسانی اجتماع میں چار باتیں، جن کا ذکر آگے آتا ہے پیدا نہیں ہوگئیں وہ کامیاب نہیں ہوا۔ اسی طرح وہ ان کے بغیر آئندہ بھی کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔

وہ چار باتیں یہ ہیں :

ا۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (جنہوں نے ایمان اختیار کیا)۔

"نظریہ" اور "ایمان"

اس آیت میں 'ایمان' سے کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ جب تاریخ عالم کی شہادت پیش کی گئی ہے تو ایمان کے معنی بھی وہی لئے جانے چاہئیں۔ جو دنیا کے تمام دینوں میں اصولی طور پر مانے جاتے رہے ہیں۔

مولانا محمد قاسمؒ فرماتے ہیں کہ "جب تم کوئی کام کرنا چاہتے ہو تو سب سے پہلے اس کی نیّت یا ارادہ کرتے ہو۔

اگر کوئی شخص یہ نیت یا ارادہ کرلے کہ میں اللہ کے سب حکموں کی تعمیل کروں گا تو یہ جامع نیت ایمان ہے۔"

جن لوگوں نے قرآن حکیم کو مانا یا اس سے پہلے جنہوں نے تورات یا انجیل کو تسلیم کیا انہوں نے ان کتب الٰہیہ میں معیّن اصول پانے اور ان اصولوں کو مان کر ان پر عمل کرنے کی پختہ نیت بنالی اور انہیں انسانی اجتماع میں قائم کرنے کے لئے اپنا جان کر ان پر عمل کرنے کی پختہ نیت بنالی اور انہیں انسانی اجتماع میں قائم کرنے کے لئے اپنی جان و مال تک قربان کرنے کا ارادہ کرلیا، اسے ان کا "ایمان" کہا جائے گا۔ لیکن جن انسانی گروہوں میں ایسی الہامی کتابیں موجود نہیں ان کے اندر حکمائے الٰہی کی کوششوں سے جو صحیح علم آیا جس نے انہیں خدا پرستی کی راہ پر لگایا اور انہوں نے اسے تسلیم کرکے اس کے مطابق کام کرنے کا ارادہ کرلیا اور اس کی خاطر اپنی جان و مال قربان کرنے کا تہیہ کرلیا تو یہ ان کا ایمان ہوگا۔ اسلام نے ایمان کا جو مختصر اور جامع فارمولا پیش کیا ہے وہ ایمان مجمل میں یہ ہے :

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ۔

(یعنی میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا جیسا بھی وہ اپنے اسماء و صفات کے ساتھ ہے اور میں نے زبان سے اقرار اور دل کی تصدیق سے اس کے تمام کے تمام احکام قبول کرلئے۔)

پس قرآن کہتا ہے کہ کسی اجتماع کے کامیاب ہونے کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس کے افراد کے دلوں میں صحیح علم کو اپنی جان و مال کی قربانی کے ذریعے سے قائم کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہو۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ جو جماعت ایسے لوگوں سے بنی ہوئی نہ ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوئی اور نہ کبھی کامیاب ہوسکتی ہے۔

فلسفہ ولی اللّٰہی کی بنیاد :

امام ولی اللہ دہلویؒ نے تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ تمام الہامی شریعتوں کا موضوع انسانیت عامہ ہی رہا ہے۔ یعنی یہ تمام شریعتیں انسانی فطرت کی ترجمانی کرتی تھیں اور اسی کے تزکیے اور ترقی کے لئے آئی تھیں۔ مختلف شریعتوں میں جو ظاہری اختلاف نظر آتا ہے، یہ ان قوموں کے لحاظ سے ہے جن میں وہ آئیں، ورنہ حقیقت میں ان سب شریعتوں کی تہ میں انسانی فطرت ہی کی ترجمانی کی گئی ہے اور سب میں مشترک امر یہی انسانیت عامہ ہے۔

اس لحاظ سے ہم نے اوپر جو کچھ بیان کیا ہے، اسے یوں بھی ادا کیا جاسکتا ہے کہ جب تک کوئی شخص ایسے صحیح عقائد یعنی ترقی بخش نظام معنوی کا مالک نہ ہو، جن کی بنیاد انسانی فطرت پر ہو اور وہ ان عقیدوں کو عمل میں لانے کے لئے اپنا نصب العین اس طرح سے نہ بنالے کہ وہ ان پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو آمادہ ہوجائے، اس وقت تک وہ کامیابی کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔

چنانچہ امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ :

وَیَجِبُ بَذْلُ الْجُهْدِ عَلٰی اَهْلِ الْاٰرَآئِ الْکُلِّیَةِ فِیْ اِشَاعَةِ الْحَقِّ وَتَمْشِیَتِه وَاخْمَالِ الْبَاطِلِ وَصَدِّه فَرُبَمَا لَمْ یَکُنْ ذٰلِكَ اِلاَّ بِمُخَاصَمَاتٍ اَوْ مُقَاتَلَاتٍ، فَیُعَدّ کُلُّ ذٰلِكَ مِنْ اَفْضَلِ اَعْمَالِ الْبِرِّ۔ (حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول ص ۵۰)

"یعنی جو لوگ اجتماعی رنگ میں سوچتے ہیں، ان کے لئے لازم ہو جاتا ہے کہ حق کی اشاعت کرنے اور اسے چلانے میں اور باطل کو مٹانے اور اسے روکنے میں اپنی پوری پوری کوشش صرف کریں، لیکن یہ اکثر ممکن نہیں ہوتا جب تک حق کی حقانیت اور باطل کی غلطی دلائل و براہین کے ذریعے ثابت نہ کر دی جائے، یا باطل کے مٹانے اور حق کے قائم کرنے کے لئے جان و مال کی قربانی کے ذریعے سے قتال نہ کیا جائے، اس وقت ان میں سے ہر ایک بات بہترین نیکی شمار ہوتی ہے"۔

غرض کامیابی کے لئے کوئی بلند نظریہ یا نصب العین قائم کرنا ضروری ہے، جسے ایمان کا درجہ دیا جاسکے۔ مسلمانوں کا انقلابی نصب العین قرآن حکیم کی تعلیمات ہیں، جنہیں خیر القرون (نمونہ کا دور) میں عمل میں لا کر دکھایا جاچکا ہے اور وہی نمونہ ہمیشہ کامیابی کا معیار ہے۔

تاریخ کی شہادت :

کیا تاریخ سے کوئی شہادت پیش کی جاسکتی ہے کہ کسی شخص یا جماعت نے کوئی جامع نظریہ "ایمان" اختیار کئے بغیر کامیابی حاصل کی ہو؟

۲۔ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (اور صالح اعمال کئے)

عمل صالح کیا ہے؟ بدن انسانی کی ہر وہ حرکت و سکون جو انسان کے ایمان کے مطابق ہو اور اس کی تعمیل و تکمیل کے لئے ہو، عمل صالح ہے۔

عمل کی صالحیّت کا مدار :

اصل میں کسی عمل کا اچھا یا برا ہونا، اس کی ظاہری شکل کے اعتبار سے اتنا نہیں ہوتا، جتنا اس کی روح کے لحاظ سے اور کرنے والے کی اس نیت کے اعتبار سے ہوتا ہے جو اسے عمل پر اکساتی ہے۔ مثلاً دنیا کی تمام قوموں میں یہ مانا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا بہت اچھا فعل (عمل صالح) ہے۔ گو ہر ایک قوم میں عبادت کی صورت الگ الگ رہی ہو۔ لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے اور اس کا قرب حاصل کرنا انسان کے لئے

ضروری ہے۔ یہ قرب حاصل کرنے کا جذبہ ہی عبادت یا صلوٰۃ کی اصل روح ہے، اب اگر یہی عبادت صرف دکھاوے کے طور پر کی جائے تو سب سے برا عمل تصور کی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں اس کی پر زور مذمت کرتے ہوئے کہا گیا ہے :

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ (۱۰۷: ۴-۶)

(افسوس ہے، ان نمازیوں پر! جو اپنی نماز سے بے خبر صرف دکھاوے کے لئے نماز پڑھتے ہیں۔)

ایسے ہی کسی انسان کو مار ڈالنا بظاہر کتنی بری بات معلوم ہوتی ہے! سب قوموں کے عقل مند لوگ اسے برا کہتے ہیں اور کہتے آئے ہیں، لیکن جب حق کی حمایت میں مرنے اور مارنے کی نوبت آجائے یا کمزور انسانوں کو ظلم سے بچانے کی ضرورت پڑ جائے تو کوئی شخص بھی ظالموں کو قتل کرنے سے انکار نہیں کرتا، بلکہ اس وقت انسانی قتل کو بہت قابل تعریف فعل سمجھا جاتا ہے۔

پس جو کام انسان کے ایمان کے مطابق ہو، اور اس نیت سے کیا جائے کہ سب انسانوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے وہ عمل صالح ہے۔

"ایمان" اور عمل صالح کا تعلق :

اصل میں ایمان جڑ ہے عمل کی۔ جب تک جڑ زندہ ہے، درخت زندہ ہے۔ جب جڑ مر جاتی ہے درخت خود بخود مرجھا کر گر جاتا ہے۔ اسی طرح معاشرہ میں ایمان انفرادی اور اجتماعی کاموں کی بنیاد ہے۔

چنانچہ قرآن حکیم کہتا ہے :

۱۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ (العنکبوت : ۲)

(کیا لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ اتنا کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ "ہم ایمان لے آئے" اور ان کی جانچ نہ ہوگی؟)

۲۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (ال عمران : ۱۴۲)

(یا تمہیں خیال ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ اللہ نے ابھی تک معلوم نہیں کیا جو تم میں لڑنے والے ہیں اور معلوم نہیں کیا جو ثابت قدم ہیں)۔

۳۔ سورہ توبہ میں منافقین سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے کہ :

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ (۹: ۱۰۵)

(اور کہہ دو کہ عمل کئے جاؤ پھر آگے اللہ اور اس کا رسول اور مسلمان تمہارے کام کو دیکھ لیں گے۔)

۴۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی حمایت ان کے اعمال کی وجہ سے کرتا ہے نہ کہ ان کے صرف اقوال کی وجہ سے:

وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۲۷﴾ (۶: ۱۲۷)

۵۔ اور اصلی مومنوں کے اعمال یہ بتائے گئے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ (۸: ۷۴)

(اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے گھر چھوڑے اور اللہ کی راہ میں لڑے اور جن لوگوں نے انہیں جگہ دی اور ان کی مدد کی وہی سچے مومن ہیں۔)

۶۔ اجتماعی طور پر اقوام کا امتحان بھی عمل کے مطابق ہوتا ہے محض عقیدوں کی بناء پر نہیں:

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ (۱۰: ۱۳-۱۴)

(اور ہم یقیناً تم سے پہلی جماعتوں کو جب انہوں نے ظلم کیا، ہلاک کر چکے ہیں۔ حالانکہ انکے پاس ان کے رسول کھلی نشانیاں لائے تھے، لیکن وہ ایمان لانے والے نہ ہوئے۔ ہم مجرموں کی قوم کو اسی طرح سے سزا دیا کرتے ہیں، پھر ان کے بعد ہم نے تمہیں زمین میں خلافت دی۔ [1] تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح سے عمل کرتے ہو)۔

آخر میں قرآن حکیم نے یہ قطعی اور حتمی قانون فطرت بیان کر دیا ہے:

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ (۴: ۱۲۳-۱۲۴)

(مدار نہ تمہاری امیدوں پر ہے نہ اہل کتاب کی امیدوں پر، جو کوئی برا کام کرے گا سزا پائے گا۔ اور اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور مددگار نہ پائے گا۔ اور جو کوئی اچھے کام کرے گا وہ مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کا حق تِل بھر بھی ضائع نہ ہوگا)۔

خلاصہ یہ کہ ایمان قائم کرنے کے بعد اگر نتائج نکل سکتے ہیں تو فقط عمل سے اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى (۵۳: ۲۴) (کیا انسان کو صرف کسی چیز کی تمنا کر لینے ہی سے وہ مل سکتی ہے؟) نہیں بلکہ قاعدہ صرف یہ ہے کہ: لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳: ۳۹) (انسان کو وہی یا اتنا ہی ملتا ہے، جو یا جتنا وہ خود عمل کرتا ہے)۔

غرض ایمان، عمل کی بنیاد ہے اور عمل ایمان کا نتیجہ، ایمان ایسا ہونا چاہئے جو عمل پر اکسائے اور عمل وہ ہو جو ایمان کے مطابق ہو۔

---

[1] امام ولی اللہ دہلویؒ کی اصطلاح میں خلافت سے مراد بین الاقوامی حکومت ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ص ج)

تاریخ کی شہادت :

اب تاریخ پر نظر ڈالو، کیا اس میں ایک بھی شہادت یا مثال ملتی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ کسی اجتماع میں لوگوں نے اچھے عقیدے یا صحیح علم کو اپنا ایمان تو بنالیا، لیکن انہوں نے اپنی پوری زندگی اپنے ایمان کے مطابق نہ ڈھالی پھر بھی وہ اپنے ایمان کو غالب کرنے میں کامیاب ہوگئے؟ تاریخ کے سارے ورق الٹ جاؤ، اس کی ایک مثال بھی نہ پاؤ گے۔ البتہ تاریخ انسانی سے جو حقیقت بلاتردید ثابت ہوتی ہے، وہ یہی ہے کہ کامیاب وہی لوگ ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے ایمان کے مطابق کام کیا اور اسے اجتماع میں غالب کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادی۔ پس ایمان کے مطابق کام کرنا اور سر دھڑ کی بازی لگادینا ہی اصل میں عمل صالح ہے۔ اور ہمیشہ کامیابی اسی سے حاصل ہوئی ہے اور اسی سے حاصل ہوگی۔

الحق کیا ہے؟

۳۔ وَتَوَاصَوۡاِبالۡحَقِّ (وہ آپس میں حق کی تلقین کرتے ہیں۔)

بنیادی طور پر حق میں پختگی اور ثبوت کے معنی پائے جاتے ہیں، جب تک کوئی بات صرف علم کے درجے تک ہے ضروری نہیں کہ وہ عمل پر اکسائے، لیکن جب کسی بات کا علم یقین کے اس درجے تک پہنچ جائے کہ وہ عمل صالح پر بھی اکسائے تو وہ حق بن جاتا ہے۔[1] اسی طرح جب ایمان انسان کے ہر عمل کی بنیاد بن جائے اور وہ اس کے سوا کسی اور چیز کو قبول نہ کرے بلکہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اگر یہ ایمان کسی طرح میرے دماغ میں سے نکال لیا گیا تو میں مر جاؤں گا؟ اس وقت وہ ایمان، حق کا درجہ حاصل کرلیتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر انسان اپنے ایمان میں امن اور اس کے مطابق عمل کرنے کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے میں راحت پاتا ہے۔

پارٹی کی ضرورت

اگر کوئی شخص کسی عقیدے یا صحیح علم کو اپنا ایمان بنالے اور اس کے مطابق عمل بھی کرے اور اپنا جان و مال اور سب کچھ اس پر قربان کردینے کا پختہ ارادہ بھی رکھتا ہو، تو وہ اجتماع میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے ساتھ ایسے لوگوں کو نہ ملائے جن کا ایمان اس کے اپنے ایمان جیسا ہو اور پھر وہ سب مل کر اپنے مشترک ایمان کی تکمیل کے لئے پوری پوری اور انتہائی جدوجہد کریں اور اگر اپنے میں سے کسی کے ایمان یا عمل میں کمزوری

[1] کیونکہ جب کوئی تعلیم محض علم کے درجے سے نکل کر سوسائٹی میں گڑ جاتی ہے وہ مضبوط ہوجاتی ہے۔

یا کوتاہی پائیں تو اسے ایمان پر قائم رہنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی تلقین کریں۔ [1]

پروپیگنڈے کی ضرورت :

حقیقت یہ ہے کہ حق کی اشاعت کرنا ہی وہ ذریعہ ہے جس سے وہ اجتماع میں پھیلتا ہے اس سے پارٹی پیدا ہوتی ہے اور ترقی کرتی ہے جب تک حق کی حمایت میں قربانی دینے والی جماعت (پارٹی) پیدا نہ ہو جائے اجتماع میں حق قائم ہو ہی نہیں سکتا۔ تاریخ ایسی مثالیں تو پیش کرتی ہے کہ ایک اولوالعزم نبی جانفروش افراد کی جماعت ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے ناکام رہا لیکن وہ ایسی کوئی مثال پیش نہیں کرتی کہ ایک صالح عمل، صاحب ایمان فرد، تن تنہا، جماعت کے بغیر حق کو غالب کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ [2] امام ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں :

وَهٰذَا الْاِمَامُ الَّذِیْ یَجْمَعُ الْاُمَمَ عَلٰی مِلَّةٍ وَاحِدَةٍ یَحْتَاجُ اِلٰی اُصُوْلٍ اُخْرٰی غَیْرِ الْاُصُوْلِ الْمَذْکُوْرَةِ فِیْمَا سَبَقَ، مِنْهَا اَنْ یَّدْعُوَا قَوْماً اِلَی السُّنَّةِ الرَّاشِدَةِ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُصْلِحَ شَانَهُمْ ثُمَّ یَتَّخِذَهُمْ بِمَنْزِلَةِ جَوَارِحِه فَیُجَاهِدُبِهِمْ اَهْلَ الْاَرْضِ وَیُفَرِّقَهُمْ فِی الْاٰفَاقِ وَهُوَ قَوْلُهٗ تَعَالٰی: کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ، اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳: ۱۱۰) وَذٰلِكَ لِاَنَّ هٰذَا الْاِمَامَ نَفْسَهٗ لَایَتَاَتّٰی مِنْهُ مُجَاهِدَةُ اُمَمٍ غَیْرِ مَحْصُوْرَةٍ (حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص۱۱۸)

”یعنی اس امام کو جو تمام قوموں کو ایک ملت پر جمع کرے، ان اصولوں کے علاوہ جن کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں، اور اصولوں کی ضرورت ہے۔ ان اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ پہلے ایک جماعت کو صحیح پروگرام کی دعوت دے، انہیں (ان کی غلط کاریوں سے) پاک کرے، پھر ان کی حالت کو درست کرے اور پھر انہیں اپنا آلہ کار بنائے، اور ان کی مدد سے تمام دنیا سے جنگ کرے اور انہیں دنیا بھر میں (دعوت و تبلیغ کے لئے) پھیلا دے۔ چنانچہ قرآن حکیم کی اس آیت : ”کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ، اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ“ (۳:۱۱۰) (تم بہترین امت ہو جو تمام انسانوں کے لئے پیدا کی گئی ہے) کا یہی مطلب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ امام، تن تنہا تمام قوموں سے لڑ نہیں سکتا۔“

---

[1] یہ عمل تواصی بالحق ہے اس عمل میں کبھی کسی بات کے کرنے کا حکم دیا جائے گا اور کبھی کسی بات کے کرنے سے روکا جائے گا اس لحاظ سے قرآن حکیم میں اسے امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی کہا گیا ہے۔

[2] یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں کئی جگہ ”مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗٓ“ (۴۸: ۲۹) (محمد ﷺ اور ان کے ساتھی) آیا ہے۔ (یعنی آپ کی کامیابی کو آپ کے ساتھیوں کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے)۔ بلکہ ایک جگہ تو صریح لفظوں میں حکم دیا گیا ہے کہ ”وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَیْنٰكَ عَنْهُمْ“ (سورہ کہف ۱۸: ۲۸) (یعنی تو صرف ان لوگوں کے ساتھ وابستگی رکھ جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے رہتے ہیں۔ وہ صرف اس کی رضا کے طالب ہیں اور تیری آنکھیں انہیں چھوڑ کر نہ دوڑیں۔) آنحضرت اکی پوری زندگی اس آیت کی مکمل تفسیر ہے۔

تاریخ کی شہادت :

اب پھر انسانی تاریخ پر نظر ڈالو اور دیکھو کیا ایک مثال بھی ایسی ملتی ہے کہ ایک شخص ایمان اور عمل صالح کے باوجود اپنے ساتھ اپنے جیسے ہم خیال لوگوں کو جمع کئے بغیر اکیلا اور تن تنہا اجتماع میں اپنے ایمان کو غالب کرنے میں کامیاب ہو گیا؟ تاریخ اس کی ایک مثال بھی پیش کرنے سے عاجز ہے۔

"صبر" کیا ہے؟ :

۴۔ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (وہ آپس میں صبر کی تلقین کرتے ہیں۔)

جب انسان اپنے ایمان کے مطابق کام کرتا ہے اور اسے تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کی راہ میں بے شمار مشقتیں اور مشکلیں پیش آتی ہیں، وہ انہیں جھیلتا ہے، ان کا مقابلہ کرتا ہے اور اپنے ایمان پر مردانہ وار ڈٹا رہتا ہے۔ یہ صبر ہے۔

کفر کیا ہے؟ :

اگر رکاوٹیں زیادہ ہوں تو اس میں کوئی وجہ نہیں کہ انسان آگے قدم نہ بڑھائے اور ٹائم مارک (Mark Time) کرتا رہے، لیکن مشکلات سے گھبرا کر شکست مان لینا اور اصول سے پیچھے ہٹ جانا ہرگز جائز نہیں۔ ایماندار آدمی کا صرف ایک کام ہے۔ فرض ادا کرتا ہوا جان دے دے، یا ٹائم مارک (Mark Time) کرے اور جب آگے بڑھنے کا موقع پیدا ہو، فوراً قدم آگے بڑھائے۔ اصول سے پیچھے ہٹ جانا اور اپنے ایمان کا انکار کر دینا کفر ہے۔ جو شخص کسی حالت میں بھی پیچھے ہٹ جانے کو جائز سمجھ لیتا ہے وہ کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ایمان والوں کے اجتماع کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ اپنے جس ساتھی کو پھسلتا یا کمزور ہوتا پائیں، اسے سہارا دے کر گرنے سے روکیں۔ صرف اسی صورت میں اجتماع کامیاب ہو سکتا ہے۔

یہاں یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہئے کہ کسی اجتماع میں جو ایمان کسی نظریے پر قائم ہوا ہو، اس میں دو وجہ سے کمزوری آسکتی ہے :

(الف) اس میں ضرورت کے مطابق مالی اشتراک نہ ہو اور دولت سارے اجتماع میں چکر لگانے کی بجائے ایک چھوٹے سے طبقے میں بند ہو کر رہ جائے۔ اس حالت میں ایک بہت بڑا طبقہ نادار رہ جاتا ہے۔ اب اگر مالدار لوگ خود داد عیش دیتے رہیں اور اپنے نادار ساتھیوں کو ایمان پر قائم رہنے اور قربانیاں دینے کی تلقین

کرتے رہیں تو اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، بلکہ بد دلی بڑھتی ہے، جس سے دشمن کو ریشہ دوانیاں کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

اجتماع کی اندرونی پختگی اور مضبوطی کے لئے ضروری ہے کہ ذرائع پیداوار کی تقسیم اس طرح سے ہو کہ سارے اجتماع کی طبعی بنیادی ضرورتیں، یعنی خوراک، لباس، مکان، تعلیم، صحت وغیرہ پوری ہوتی رہیں، اگر ایسا نہ ہوا تو نادار افراد اپنی ان ضرورتوں کے پورا کرنے میں اتنے پھنس جاتے ہیں کہ وہ اپنے ایمان کی تکمیل سے قاصر رہ جاتے ہیں اور ہوتے ہوتے وہ اس تحریک سے بالکل ہی کٹ جاتے ہیں اس طرح سے تحریک مر جاتی ہے۔

امام ولی اللہ دہلویؒ، ایرانی اور رومی شہنشاہیتوں کی بربادی کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ ان ملکوں کے مالدار طبقے اپنی عیش سامانیوں کے لئے کاشتکاروں اور تاجروں وغیرہ پر بڑے بڑے ٹیکس لگاتے رہتے تھے:

جَعَلُوْا هُمْ بِمَنْزِلَةِ الْحَمِيْرِ وَالْبَقَرِ يُسْتَعْمَلُ فِى النَّضْحِ وَالدِّيَاسِ وَالْحَاجَاتِ۔ وَلَا تُتْقٰى اِلَّا لِيُسْتَعَانَ بِهَا فِى الْحَاجَاتِ ثُمَّ لَا تُتْرَكُ سَاعَةً مِنَ الْعَنَاءِ حَتّٰى صَارُوْا لَا يَرْفَعُوْنَ رُؤُسَهُمْ اِلَى السَّعَادَةِ الْاُخْرَوِيَّةِ اَصْلاً وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ذٰلِكَ

(حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۰۵، ۱۰۶)

(انہیں گدھے اور بیل بنا چھوڑتے تھے، جنہیں آبپاشی کرنے، فصل کاٹنے اور گاہنے اور اپنی حاجتیں پوری کرنے میں استعمال کے لئے زندہ رکھتے تھے، انہیں محنت مشقت سے ایک دم کی بھی فرصت نہ ملتی تھی کہ آخرت کی سعادت پر غور کر سکتے۔ رفتہ رفتہ ان میں ان امور پر غور کرنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی تھی۔)

(ب) اس میں علمی اشتراک نہ ہو، یعنی جس عقیدے یا صحیح علم کو ایمان بنایا گیا ہے اس کے متعلق اجتماع کے ہر ایک رکن کو کم سے کم ضروری معلومات پوری طرح سے حاصل نہ ہوں، بلکہ چوٹی کے چند لیڈر ہی تحریک کا علم رکھیں اور وہی پالیسی بنائیں اور عوام اس علم سے محروم ہوں اور پارٹی کے چلانے میں ان کا کوئی ہاتھ نہ ہو۔ یہ برہمن ازم (Brahmanism) ہے۔ اس صورت میں دشمن کا پروپیگنڈہ سخت خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ وہ پہلے تو جاہل لوگوں کے دلوں میں ایمان کے متعلق وسوسہ پیدا کرتا ہے، پھر وسوسہ بڑھتے بڑھتے شک میں بدل جاتا ہے اور پھر ہوتے ہوتے شک انکار کی شکل اختیار کر لیتا ہے، کبھی دشمن وھن (کمزور) یقین لوگوں کو اندرونی انتشار پیدا کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے، لیکن اگر ہر شخص کو ضروری علم حاصل ہو تو کوئی بھی وسوسے میں مبتلا نہیں ہوتا اور تحریک، دشمن کے فکری حملے سے محفوظ رہتی ہے۔

غرض مشکل حالات میں افراد کو ایمان پر قائم اور عمل پر آمادہ رکھنے کی عملی صورت اس کے سوا اور کوئی نہیں

ہو سکتی کہ اجتماع میں افراد کی ضرورت کے مطابق مالی اشتراک ہو اور ضروری علم عام ہو، کوئی شخص نہ بھوکا ننگا رہے اور نہ جاہل اور بے خبر۔

مساوات :

جب اجتماع میں بقدر ضرورت مالی اور عملی اشتراک پیدا ہو جاتا ہے، تو اس میں ہر فرد کی بدنی اور عقلی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، کمزوروں کی خبر گیری اور ظالموں کی سرکوبی کا نظام مضبوط ہوتا ہے، اس وقت اس اجتماع میں لیڈر شپ صرف ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، جو عوام کی خدمت کرنے میں سب سے آگے اور عدل وانصاف قائم رکھنے میں سب سے زیادہ فکر مند ہوتے ہیں۔

تاریخ کی شہادت :

اب تاریخ انسانی پر ایک نظر ڈالو! کیا اس کے اوراق اپنے اندر اس کی ایک مثال بھی رکھتے ہیں کہ کسی بلند نظریئے پر پارٹی بن جانے اور باوجود اس کے کہ افراد میں ایمان اور عمل صالح بھی موجود ہوں، وہ پارٹی استقامت کے ساتھ کام کرنے اور اندرونی مالی اور عملی اشتراک کے بغیر ہی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی ہو؟

انقلابی جماعت اور منافقین :

"لیکن وہ نصب العین یا مقصد جسے ایمان بنالیا گیا ہے، بالکل صاف، واضح اور معین ہونا چاہیئے، کیونکہ اسی صورت میں افراد پارٹی میں شامل ہو کر متحدہ طور پر کام کر سکتے ہیں۔ اگر نصب العین معین نہ ہو تو ہر شخص اپنے اپنے مطلب کی معنی لے گا اور وہ نصب العین ہی جماعت (پارٹی) کے انتشار فکر کا باعث بن جائے گا۔ تاریخ اس امر کی بیسیوں مثالیں پیش کر سکتی ہے کہ نصب العین واضح نہ ہونے کے سبب سے پارٹی ہمیشہ اختلافات کی آماجگاہ بنی رہی اور وہ اپنے نصب العین کو عمل میں نہ لا سکی۔ تاریخ اسلام میں اس کی مثال خوارج کی ہے جن میں نصب العین کی ترجمانی کے اختلافات پیدا ہوتے رہے اور یہ جماعت اپنی مستقل حکومت پیدا نہ کر سکی۔

کوئی نصب العین جتنا واضح اور معین ہو گا، اتنا ہی اس پر ایمان لانے والے اس کی خاطر جان دینے پر زیادہ آمادہ ہو سکیں گے اور جتنا غیر معین اور مبہم ہو گا اتنا ہی فرار کی راہیں کھلیں گی اور لوگوں کو جان ومال بچانے کا موقع ملے گا۔ ظاہر ہے کہ جس تحریک میں جان ومال بچانے کا موقع مل جائے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نصب العین تو معین ہے، لیکن بعض وہ ارکان، جو اپنے ذاتی مفادات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے دلوں میں کچھ ہوتا ہے وہ ظاہر کچھ اور کرتے ہیں، یہ لوگ منافق کہلاتے ہیں۔ وہ مشکل ہی سے کامیاب ہوتے ہیں۔ انقلاب کی مرکزی جماعت (سینٹرل کمیٹی) کا فرض ہوتا ہے کہ انقلابی پروگرام کی ترجمانی میں ایسے لوگوں کو داخل نہ کرے، اگر کوئی داخل ہو چکا ہو تو اسے جس طرح بھی ممکن ہو غیر مؤثر بنا دے۔

بعض اوقات کم علم یا جاہل ارکان بھی نصب العین کے مبہم بنانے میں حصہ لیتے ہیں، ان کی تعلیم کا پورا پورا بندوبست ہونا چاہئے، تاکہ یہ لوگ نصب العین کے متعلق صحیح علم حاصل کریں اور لاعلمی میں ٹامک ٹوئیاں مارتے نہ پھریں۔

ان دونوں صورتوں میں یعنی منافقوں اور جاہلوں کی موجودگی میں ساری جماعت کی علمی قوتیں ایک مرکز پر جمع نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے ان دونوں کا انسداد ضروری ہے۔

سورت کا خلاصہ :

اس سورت کا خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ گواہ ہے کہ انسان اجتماعی تحریک میں چار اصول اختیار کرکے ہی کامیاب ہو سکتا ہے :

(۱) ایسے عقیدے یا علم کو جس سے سارے اجتماع انسانی کو فائدہ پہنچتا ہو، اپنا نظریہ جان کر کام کرنا۔

(۲) اس نظریے کے مطابق عملی زندگی بسر کرنا۔

(۳) اس نظریے پر ایک مضبوط جماعت پیدا کرنا۔

(۴) اس جماعت یا پارٹی کا انتشار پیدا کرنے والے بیرونی اور اندرونی حملوں سے محفوظ ہونا۔

(الف) بقدر ضرورت مالی اشتراک کے ذریعے سے، اور

(ب) علمی اشتراک کے ذریعے سے۔

ان میں سے پہلی دو باتوں کا تعلق اجتماع کے ہر ایک فرد کی ذات سے ہے۔ جب تک کسی فرد میں یہ دونوں باتیں نہ ہوں، یعنی وہ ایک مشترک نظریے کو قبول کرکے اسے ایمان نہ بنالے، اپنی جان و مال اس پر قربان کرنے کے لئے وقف نہ کردے اور اپنی پوری زندگی اس نظریے کے مطابق بسر کرنے کا پختہ ارادہ نہ کرلے، اس وقت تک وہ پارٹی میں جگہ نہیں پا سکتا۔

باقی دو باتیں اجتماع کے متعلق ہیں۔ یعنی پارٹی میں اندرونی اشاعت ہو، تاکہ ہر رکن اس نظریے کو جسے سب

نے ایمان بنالیا ہے، اچھی طرح سمجھے اور اس پر قائم رہے۔ اور بیرونی پروپیگنڈا ہو، جس سے پارٹی کے ارکان میں روز بروز اضافہ ہوتا رہے۔ نیز اس جماعت میں بقدر ضرورت مالی اور علمی اشتراک ہو، تاکہ تمام افراد اطمینان قلب اور روشن دماغی کے ساتھ کام کرتے رہیں اور ایک دوسرے کو مالی اور علمی مدد دیتے رہیں۔ جس اجتماع میں یہ باتیں نہ ہوں وہ توڑ دینے کے لائق ہے۔

انقلاب :

یہ چھوٹی سی سورت قرآن حکیم کی انقلابیت کو پوری طرح سے واضح کرتی ہے، اس میں انقلاب کے وہ اصول بیان کئے گئے ہیں، جن کے مطابق حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے عمل کر کے قرآن حکیم کی حکومت قائم کر دکھائی۔ یہی وہ نمونہ ہے جس کی پیروی کرنے کا تمام انسانوں کو حکم دیا گیا ہے۔ جیسے ریاضی کے چار ابتدائی قاعدے (یعنی جمع، تفریق، ضرب، تقسیم) ہیں۔ نہ ریاضی کے ان قاعدوں کے استعمال سے کسی غلط نتیجے کے نکلنے کی توقع ہو سکتی ہے، نہ انقلاب کے ان اصولوں کے استعمال سے کسی خلاف توقع نتیجہ نکلنے کا اندیشہ۔ ایسے ہی ریاضی کے ہر ایک قاعدے کے استعمال سے جو نتیجے حاصل ہوتے ہیں، وہ اسی قاعدے کے استعمال سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ کسی اور قاعدے کے استعمال سے نہیں۔ ایسے ہی انقلاب سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے، وہ کسی اور طریقے سے حاصل ہونا ناممکن ہے۔

حقیقت میں انقلاب ایک طریق کار (Methodology) ہے، جس کے تین حصے ہیں :

۱۔ نصب العین (Ideal)

۲۔ جماعت (Party)

۳۔ لائحہ عمل (Programme)

اس لحاظ سے اس سورت کا تجزیہ کیا جائے تو... "الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" میں نصب العین معین کرنے کی ضرورت اور اس کے مطابق عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

"وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ" میں جماعت کی ضرورت جتائی گئی ہے اور اس کے پیدا کرنے کا طریق بتایا گیا ہے۔

"وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" میں انقلاب کے عملی پروگرام یا لائحہ عمل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

نوع انسانی کی ساری تاریخ گواہ ہے کہ، ان چار قاعدوں کو عمل میں لائے بغیر انسان کبھی حق کو قائم نہیں کر سکا اور تاریخ کا یہ مسلسل عمل ظاہر کرتا ہے کہ ان چاروں اصولوں پر عمل کئے بغیر کوئی جماعت کبھی حق کو قائم کرنے میں

کامیاب نہیں ہو سکتی۔ تاریخ اسلام کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے لے کر سیدنا عثمان غنیؓ کی شہادت یا زیادہ سے زیادہ سیدنا علی المرتضیٰؓ کی خلافت کے ابتدائی دو سال تک جو پچاس برس کا زمانہ ہے، وہ انقلاب کی یہ تمام شرطیں پوری کرتا ہے۔ اس زمانے میں قرآنی نظام سیاست، معاشیات اور قرب الٰہی حاصل کرنے کے طریقوں کو غالب کرنے کا نصب العین معین شکل میں ان کے سامنے تھا۔ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ (۹: ۱۰۰) (مہاجرین اور انصار میں سے ابتدائی مسلمان، وہ مرکزی جماعت تھی جو حزب اللہ (اللہ کی پارٹی) کی رہنمائی کرتی تھی)۔ انہوں نے اپنی ضرورتوں کے مطابق فوجی لائحہ عمل مکمل کیا۔ پہلے، عرب پر قبضہ کر کے قومی انقلاب قائم کیا، پھر ایران اور روم کے علاقوں پر قبضہ کیا اور پھر رفتہ رفتہ مشرق اور مغرب کی طرف بڑھے اور نہایت شاندار کامیابیاں حاصل کیں وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (بقرہ۲: ۱۱۵) (اور مشرق اور مغرب اللہ ہی کے لئے ہیں)۔

آج بھی مسلم نوجوان انقلاب کے انہی اصولوں کو اختیار کر کے قومی اور بین الاقوامی کامیابیاں حاصل کر سکتا ہے۔ ان اصولوں کو اختیار کئے بغیر وہ قرآن حکیم کو کبھی بھی کامیابی کے ساتھ کامل طور پر قائم نہیں کر سکتا، اور یہ بات بھی واضح ہے کہ قرآنی اصول حیات کو قائم کئے بغیر دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔

قرآن حکیم کا بین الاقوامی اور عالمگیر غلبہ ہی وہ مطمح نظر ہے، جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی پارٹی کے سامنے رکھا اور جس کی کامیابی کی خاطر انہوں نے جان توڑ کوشش کی۔ آج بھی ہمارے نوجوانوں کے سامنے یہی نظریہ، یہی نصب العین اور یہی مقصد حیات ہے۔ ان انقلابی اصولوں کے مطابق دین اسلام کا غلبہ قائم ہو سکتا ہے۔ غلبہ دین کے معنی کی تشریح کرتے ہوئے حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ: دِيْنُ اللهِ کا غلبہ ادیان پر قائم کرنے کا عمل حضرت رسول اکرم ﷺ نے شروع فرمایا "فَقَهَرَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ الْاُمِّيِّيْنَ حَتّٰى دَانُوا بِالْاِسْلَامِ" (یعنی آنحضرت ﷺ نے عرب پر سیاسی غلبہ حاصل کیا، یہاں تک کہ اہل عرب اس دین کے قانون کے مطیع ہو گئے۔)

اس کے بعد بقول امام ولی اللہ دہلویؒ غلبہ اسلام کی دوسری منزل آنحضرت ﷺ کے ساتھیوں نے طے کی اور اسلام کو ایرانی اور رومی سلطنتوں پر سیاسی غلبہ دیا۔ اب مسلمان نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ بھی پہلے اپنے وطن عزیز میں قرآن کا غلبہ قائم کریں اور اس کے بعد اسے دنیا بھر کی سب سے بڑی سیاسی و معاشی طاقت بنائیں تاکہ وہ انسانی قدریں دنیا میں قائم ہو سکیں، جو وہ غالب کرنی چاہتا ہے۔ واللہ المستعان۔